اقبال کی سوانح پر نئی روشنی

[دُوسری قسط]

خرم علی شفیق

حیات اقبال کے تشکیلی دور کے بارے میں بعض نئے پہلو سامنے لائے گئے ہیں جو ماہرین کی خاص توجہ کا تقاضا کرتے ہیں۔

۱- اقبال کی بیاضوں سے سوانح اقبال میں خاطر خواہ کام نہیں لیا گیا۔
۲- اقبال سے فارسی میں شعر کہنے کا مطالبہ کرنے والی شخصیت عطیہ فیضی تھیں۔
۳- اقبال کا مقالہ لندن میں شائع ہوا تو وہیں اس پر تبصرہ ہوا اور ایک بحث کا آغاز ہوا مگر اہل وطن نے اس پر توجہ نہیں دی۔
۴- اسرار خودی کا اولین متن ایک ادھوری نظم کو سمجھا جا سکتا ہے جو بیاضوں میں موجود ہے۔
۵- عمر بھر کبھی فارسی میں گفتگو نہ کر سکنے کے باوجود اعلیٰ درجے کی فارسی شاعری کرنا قابل توجہ ہے۔
۶- اقبال اور آغا حشر کاشمیری کے تعلقات میں بعض باتوں کی بنا پر اردو ادب کے بارے میں بعض مفروضے بدلنے پڑیں گے۔

گزشتہ شمارے میں مضمون کی پہلی قسط میں اُس نئے مواد میں سے بعض چیزیں پیش کی گئیں جو سوانحی سلسلے کی پہلی کتاب اقبال: ابتدائی دَور پر نظرِ ثانی کے دوران میرے سامنے آیا تھا۔ دوسری کتاب اقبال: تشکیلی دَور تیار ہو چکی ہے اور ممکن ہے کہ اقبالیات کے اِس شمارے کے ساتھ وہ بھی آپ تک پہنچ جائے۔ اس میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء تک اقبال کی سوانح کا احاطہ کیا گیا ہے۔ نیا مواد اور نئے پہلو جو سامنے آئے اُن کا تعارف پیشِ خدمت ہے۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مندرجہ ذیل تمام نکات ایسے ہیں جو میرے خیال میں پہلے کبھی سامنے نہیں آئے۔ ناظم اقبال اکادمی جناب محمد سہیل عمر کی خاص دلچسپی کی وجہ سے مجھے دائرۂ تحقیق وسیع کرنے کا یہ موقع ملا ہے اور حیاتِ اقبال کے تشکیلی دَور کے بارے میں بعض بالکل نیا مواد اور بعض نئے پہلو پیش کیے جا رہے ہیں۔

نئے مواد میں سے مندرجہ ذیل چیزیں ماہرین کی خاص توجہ کا تقاضا کرتی ہیں:

۱- اقبال کی بہت سی بیاضیں محفوظ ہیں مگر اقبال کی سوانح میں انھیں خاطر خواہ استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ میں نے اس غرض کے لیے ایک طریقِ کار متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

۲- بانگِ درا کے دیباچے میں شیخ عبدالقادر نے لکھا ہے کہ کسی تقریب میں کسی نے اقبال سے فارسی میں شعر کہنے کی فرمایش کی۔ میرے خیال میں یہ شخصیت عطیہ فیضی تھیں اور بعض شواہد کی مدد سے تعین کیا جاسکتا ہے کہ فرمایش ۲۲ اپریل ۱۹۰۷ء کو کیمبرج میں ہوئی۔

۳- ۱۹۰۸ء میں اقبال کا تحقیقی مقالہ لندن سے شائع ہوا تو لندن میں اِس پر ہونے والے تبصرے نے ایک بحث کا آغاز کیا جو اَب تک جاری ہے، مگر ہم نے اس پر توجہ کم دی ہے۔

۴- اقبال سے روایت منسوب ہے کہ اسرار خودی پہلے اردو میں لکھنے کی کوشش کی مگر پھر وہ متن تلف کر دیا۔ بیاضوں میں ایک ادھوری اُردو نظم کو اسرارِ خودی کا اولین متن سمجھا جاسکتا ہے۔

۵- اسرار خودی فارسی میں لکھے جانے کا آغاز ایک خواب یا کشف سے ہوا۔ عمر بھر کبھی فارسی میں گفتگو کرنے کے قابل نہ ہوئے مگر اس تجربے کے بعد اپنے آپ کو فارسی میں اعلیٰ درجے کی شاعری کرتے ہوئے پایا۔ اس کے مضمرات پر غور کیا جاسکتا ہے۔

۶- اقبال اور آغا حشر کاشمیری کے تعلقات میں بعض چونکا دینے والی باتیں ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف اقبالیات بلکہ جدید اُردو ادب کے بارے میں بھی بعض مفروضے بدلنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

اِس کے علاوہ جن پہلوؤں کی طرف اقبال شناسوں نے عام طور پر توجہ نہیں دی اور اِس کتاب میں پیش کیے جا رہے ہیں اُن میں سے کچھ یہ ہیں:

۱- اقبال نے جابجا دعویٰ کیا کہ آیندہ صدیوں کے واقعات سے آگاہ ہیں۔ یکم جولائی ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں صاف لکھا کہ یہ قرآن کا مخفی علم ہے جو خدا نے اُنھیں عطا کیا ہے اور اُنھوں نے کئی برس غور وفکر کیا ہے۔ اِس دعوے کو قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے، بہرحال اس خیال کا تعاقب اقبال کی سوانح کا ایک بنیادی مسئلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

۲- مارچ ۱۹۰۷ء تک اقبال کے بنیادی نظریات کا مکمل خاکہ اُن پر منکشف ہو چکا تھا البتہ اس کے اظہار کے اسلوب کی جدوجہد میں پھر کئی موڑ آئے اور بعض اصولوں کے اطلاق میں بھی ردوقدح کے مراحل سے گزرے۔

۳- اقبال کے نزدیک خودی کی تین اہم قسمیں ہیں: خدا، ملت اور فرد۔ ان میں سے دوسری قسم اُن کی فکر کا اصل محور ہے۔

۴- اقبال اور شیخ فریدالدین عطار کے درمیان ایک گہرا تعلق ہے جس پر کافی توجہ نہیں دی گئی ہے مگر جسے سمجھنا بہت ضروری ہے۔

۵- اقبال کے افکار کی روشنی میں ''عشقِ حقیقی'' اجتماعی خودی سے عشق ہے۔ بعض اساسی داستانوں مثلاً لیلیٰ مجنوں پر اِس لحاظ سے نظرِ ثانی کی جائے تو اُن کے بعض اَسرار سامنے آتے ہیں۔

اقبال کی بیاضیں

کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اقبال کی اکثر بیاضیں بالکل درست حالت میں اقبال میوزیم میں محفوظ ہیں بلکہ اقبال اکادمی پاکستان کی لائبریری میں ان کی نقول بھی دستیاب ہیں۔ عنقریب یہ بیاضیں اکادمی کی ویب سائٹ پر بھی دستیاب ہوں گی۔ اس بنیادی ماخذ سے اقبال کے سوانح نگاروں نے بہت کم استفادہ کیا ہے۔ مجھے پہلے پہل لڑکپن میں ڈاکٹر جاوید اقبال کی تصنیف زندہ رُود میں ایک بیاض کا حوالہ دیکھ کر مزید مطالعے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ انھی دنوں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اپنے ایک مضمون میں اِسی حوالے سے بالِ جبریل کی بعض نظموں کے تدریجی مراحل کا جائزہ پیش کر کے نئے راستوں کی طرف رہنمائی بھی کی تھی۔ میں اسے انھی بزرگوں کی غائبانہ اور بالمشافہ رہنمائی کا اثر سمجھتا ہوں کہ اس سوانحی سلسلے میں اقبال کے مسودات اور بیاضوں پر ویسی توجہ دی جا رہی ہے جیسی کسی بھی ادبی شخصیت کی سوانح لکھتے ہوئے اُس کے مسودات پر ہونی چاہیے۔

اس کے مواقع پہلی کتاب میں نہ تھے کیونکہ وہ ۱۹۰۴ء کے زمانے پر ختم ہوتی تھی اور اُس زمانے کی کوئی بیاض دستیاب نہیں۔ البتہ تشکیلی دور (۱۹۰۵ سے ۱۹۱۳) کے عرصے سے تعلق رکھنے والی دو بیاضیں ملتی ہیں جن کے نمبر اقبال میوزیم کے اندراج کے حوالے سے مندرجہ ذیل ہیں:

پہلی بیاض: AIM.1977.219

دوسری بیاض: AIM.1977.195

پہلی بیاض وہی ہے جسے زندہ رُود میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے قیامِ یورپ کے زمانے کی بیاض کہا ہے لیکن مجھے یوں لگتا ہے کہ قیامِ یورپ کے زمانے میں اقبال نے اس کاپی کو صرف پتے وغیرہ نوٹ کرنے کے لیے انگریزی کی طرف سے استعمال کرنا شروع کیا اور کبھی کبھی کوئی نظم بھی اُسی طرف کے صفحوں میں درج کر لی مگر صرف اُسی صورت میں جبکہ وہ بالکل نجی نوعیت کی نظم ہو (اُس زمانے میں مخزن میں شائع ہونے والی نظمیں اِس بیاض میں نظر نہیں آتیں)۔ وطن واپسی کے بعد اُردو کی طرف والے صفحات میں پچھلے دو تین برس کی نظمیں لکھنا شروع کیں جس کا اندازہ اِس بات سے ہوتا ہے کہ نظم 'وصال' کا ایک آدھ شعر درج کر

کے چھوڑ دیا ہے۔ یہ انھی دنوں کی بات رہی ہوگی جب ۱۷ جولائی ۱۹۰۹ء کو اس نظم کی نقل عطیہ فیضی سے مانگی جیسا کہ عطیہ فیضی کے نام لکھے خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ کاپی میں کئی صفحوں کے بعد یہ نظم پوری درج ہے جو ظاہر ہے کہ اُس وقت لکھی گئی ہوگی جب عطیہ نے نظم کی نقل ارسال کی۔

اس طرح خطوط اور دیگر سوانحی شواہد کے ساتھ ملا کر بیاضوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ لگانا بھی ممکن ہے کہ کون سی نظم اندازاً کب درج کی گئی، درمیان میں کتنے صفحے چھوڑے گئے اور بعد میں کب اُنہیں پُر کیا گیا۔ اس طریقِ کار کو استعمال کر کے میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اُس زمانے میں اقبال جب کسی طویل نظم کا ارادہ کرتے تھے تو اس کا ابتدائی حصہ بیاض میں درج کر کے اس کے بعد کچھ صفحے خالی چھوڑ دیتے تھے۔ درمیان میں کسی مختصر نظم کی آمد ہوتی یا کوئی پرانی نظم دستیاب ہو جاتی تو اُسے اگلے صفحات میں درج کر دیتے۔ پھر اگر طویل نظم مکمل ہونے لگتی تو اُسے چھوڑے ہوئے صفحات میں درج کر لیتے لیکن اگر اُسے مکمل کرنے کا ارادہ ترک کر دیتے تو پھر خالی صفحات میں دوسری نظمیں درج کر لیتے۔ چنانچہ اس پہلی بیاض میں نظمیں اُس ترتیب میں درج نہیں جس ترتیب میں کہی گئیں لیکن میں نے جس طریقے کا ذکر کیا ہے اُس طریقے سے بیاض کا مطالعہ کرنے کا سب سے بڑا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ میں اس نتیجے پر پہنچ سکا کہ اسی بیاض میں درج شدہ ایک ادھوری طویل نظم دراصل اسرار خودی کا وہ اولین اُردو نمونہ ہے جس کے بارے میں ہم سنتے آئے ہیں کہ اسرارِ خودی پہلے اُردو میں لکھنا شروع کی گئی مگر جب بات نہ بنی تو وہ اشعار تلف کر دیے اور مثنوی فارسی میں لکھی۔ یہ روایت اقبال کی ایک تقریر کے بارے میں اخباری رپورٹ سے ماخوذ ہے لہٰذا معلوم نہیں کہ ابتدائی نسخہ ''تلف'' کرنے والی بات رپورٹر کے سننے یا سمجھنے کی غلطی ہے یا بیاض میں درج اشعار کے علاوہ کچھ اور شعر بھی تھے جنھیں اقبال نے تلف کر دیا۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ دسمبر ۱۹۱۰ء کے قریب اقبال نے 'نورِ محمدی' کی ذیلی سرخی کے تحت اسرارِ خودی کا پہلا باب لکھنا شروع کیا۔ 'قربانیٔ خلیل' اور خانۂ کعبہ کی تعمیر کے بارے میں ایک نظم بھی اسی سلسلے کا حصہ تھے مگر ان منظومات کو پڑھ کر صاف اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نظم میں لکھنوی مثنویوں اور مرثیوں جیسا تاثر پیدا ہو رہا تھا اور وہ تاثیر مفقود تھی جو اقبال کا اصل مقصد تھی۔

اسرارِ خودی کے اس ابتدائی متن سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مثنوی کا بنیادی خیال جہاں سے اقبال کا نظامِ فکر گویا شروع ہوا وہ انفرادی خودی نہیں بلکہ اجتماعی خودی تھی جسے سرسید احمد خاں نے اپنے افسانے 'گزرا ہوا زمانہ' (۱۸۷۳) میں ''تمام انسانوں کی روح'' کی صورت میں دلہن بنا کر پیش کیا تھا اور جسے اقبال ملتِ اسلامیہ کی خودی کہتے تھے (مزید تفصیل اس مضمون میں ذرا آگے چل کر پیش کی جائے گی)۔

فارسی میں شعر کہنے کی فرمایش

بانگِ درا کے دیباچے میں شیخ عبدالقادر نے لکھا ہے کہ اقبال کسی دوست کے یہاں مدعو تھے جب اُن سے فارسی میں شعر سنانے کی فرمایش ہوئی اور پوچھا گیا کہ وہ خود بھی فارسی میں شعر کہتے ہیں یا نہیں۔ ''اُنھیں اعتراف کرنا پڑا کہ اُنھوں نے سوائے ایک آدھ شعر کبھی کہنے کے فارسی لکھنے کی کوشش نہیں کی،'' شیخ عبدالقادر کا بیان ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دعوت سے واپس آ کر اقبال شائد باقی وقت فارسی میں غزلیں ہی کہتے رہے کیونکہ ''صبح اُٹھتے ہی جو مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں جو اُنھوں نے مجھے زبانی سنائیں۔''

اقبال کی پہلی بیاض میں ایک جگہ چار غزلیں بالکل ایک ہی انداز میں درج ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک ہی نشست میں درج کی گئی ہوں گی۔ ان میں قطع و برید بھی ہوئی ہے لہٰذا امکان ہے کہ یہی ان غزلوں کا اولین نقش ہو۔ ان میں سے تین غزلیں فارسی میں ہیں جن کے پہلے مصرعے یہ ہیں:

- اے گُل زخارِ آرزو آزاد چوں رسیدہ
- درپسِ راہزن روم دوش بہ راہبر زنم
- آشنا ہر خار را از قصۂ ما ساختی

ان میں سے پہلی غزل اقبال نے ۲۴ اپریل ۱۹۰۷ء کو عطیہ فیضی کو ایک خط کے ساتھ ارسال کی جس کی عبارت میں یہ جملہ بھی شامل تھا:

> I enclose herewith one of the poems I promised to send you, and shall feel obliged if you considered it carefully and let me know of your criticism.

عطیہ فیضی نے اپنی کتاب میں یہ خط اور غزل درج کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے صرف دو دن پہلے یعنی ۲۲ اپریل کو وہ اقبال ہی کی درخواست پر کیمبرج جا کر سید علی بلگرامی کی مہمان ہوئی تھیں جہاں ایک دلچسپ پکنک بھی منائی گئی جس کی تصویر عطیہ کی کتاب کے پہلے اڈیشن میں شامل تھی اور اب میری تصنیف *Iqbal: An Illustrated Biography* (2006) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اقبال کے خط کا جملہ اس بات کا غماز ہے کہ فارسی میں غزل کہنے کی فرمایش اسی پکنک میں ہوئی ہو گی، فرمایش کرنے والی عطیہ فیضی رہی ہوں گی اور یہ تین فارسی غزلیں جن میں سے صرف ایک انھیں بھیجی گئی غالباً وہی ہیں جو اقبال نے تقریب سے واپس آ کر کہیں۔ شیخ عبدالقادر نے صرف دو فارسی غزلوں کا ذکر کیا ہے اس لیے ممکن ہے کہ تیسری فارسی غزل اور اُردو غزل اقبال نے انھیں نہ سنائی ہو یا عبدالقادر نے خود ہی مصلحتاً ان کا ذکر نہ کیا ہو کیونکہ اردو غزل تو بالخصوص اتنی معنی خیز ہے کہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے:

یوں تو اے بزمِ جہاں دلکش تھے ہنگامے ترے
اِک ذرا افسردگی تیرے تماشاؤں میں تھی

حسن کی تاثیر پر غالب نہ آ سکتا تھا علم
اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی
پا گئی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک
مدتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی
میں نے اے اقبال یورپ میں اُسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی

یاد رہے کہ عطیہ فیضی سے اقبال کی ملاقات صرف چند ہفتے قبل یکم اپریل کو ہوئی تھی۔ جیسا کہ میں نے *Illustrated Biography* میں بھی خیال ظاہر کیا تھا، اگر فریقین نے ایک دوسرے میں کوئی کشش محسوس کی ہوگی تو اُس کی مدت زیادہ نہ رہی ہوگی کیونکہ مزاجوں میں فرق بہت تھا۔ ۲۲ اپریل کی پکنک ابتدائی دنوں کی بات ہے لہٰذا اُن دنوں عطیہ کی فرمایش کا اقبال کی فطرت پر بجلی بن کر گرنا سمجھ میں آتا ہے البتہ بعد میں اقبال نے عطیہ کے نام جس قسم کے پژمردہ خطوط لکھے وہ اقبال جیسے جذباتی انسان کا اظہارِ عشق نہیں ہوسکتا (یقین نہ آئے تو ان خطوط کا ایما کے نام خطوط سے موازنہ کر کے دیکھا جاسکتا ہے جہاں اس قسم کی عبارتیں ملتی ہیں، ''میں اپنی تمام جرمن بھول گیا ہوں، صرف ایک لفظ یاد ہے: ایما!'')۔

حال ہی میں مورخ خورشید کمال عزیز (کے کے عزیز) نے اپنے والد کی سوانح وہ حوادث آشنا میں لکھا ہے کہ وہ شخصیت جس نے اقبال سے فارسی میں شعر کہنے کی فرمایش کی دراصل اُن کے والد شیخ عبدالعزیز تھے (اسی نام کے دوسرے دوست سے خلط ملط نہ کیا جائے جن کے نام اقبال کے بہت سے خطوط موجود ہیں)۔ مجھے اِس روایت کو تسلیم کرنے میں تامل ہے جس کی وجوہات میں نے تفصیل کے ساتھ کتاب کے حواشی میں بیان کردی ہیں۔

اسرارِ خودی کا اولیں نقش

اوپر تذکرہ کیا جاچکا ہے کہ دسمبر ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ اقبال نے اپنی بیاض میں ایک طویل اردو نظم کی داغ بیل ڈالی۔ جن شواہد کی بنیاد پر یہ تاریخ متعین کی گئی اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہ اسرارِ خودی کی منسوخ شدہ شروعات ہیں وہ کتاب اور اُس کے حواشی میں تفصیل کے ساتھ دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہاں صرف دو اہم نکات کی طرف توجہ دلا کر اس نظم کا متن پیش کرنا مقصود ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ 'نورِ محمدی' والی نظموں کا یہ سلسلہ مجھ سے پہلے صابر کلوروی مرحوم کلیاتِ باقیاتِ اقبال میں پیش کر چکے ہیں لہٰذا ان نظموں کو پیش کرنے میں مجھے کسی قسم کی اولیت کا دعویٰ نہیں ہوسکتا۔ اُن کی

کتاب کا وہ حصہ جس میں حواشی تھے ابھی شائع نہیں ہوا اور نہ میری نظر سے بھی گزرا ہے لہٰذا میں یہ نہیں جانتا کہ اُن کی توجہ اِس طرف گئی تھی یا نہیں کہ یہ اسرارِ خودی کا منسوخ متن ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ بات مجھ سے پہلے اُن کی نظر میں آ چکی ہو اور صرف اشاعت میں تاخیر کی وجہ سے سامنے نہ آئی ہو۔ ایسا ہے تو میری دلی خواہش ہوگی کہ اُن حواشی کی اشاعت ہو جانے کے بعد اِس نکتے کے لیے میری بجائے اُن کی کتاب کا حوالہ دیا جائے کیونکہ بہرحال اِس میدان میں صابر مرحوم کا کام بہت پہلے شروع ہوا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے کہ 'شکوہ' لکھتے ہوئے 'جوابِ شکوہ' کا مضمون اقبال کے ذہن میں نہ رہا ہوگا بلکہ اُس کا خیال بعد میں آیا اور اسی طرح اسرارِ خودی منکشف کرتے ہوئے رموزِ بیخودی سے آگاہ نہ تھے، بعد میں ترقی ہوئی۔ دراصل ان تمام مفروضوں کے پیچھے اقبال کے ذہنی ارتقا کا ایک پست اور عامیانہ تصور کارفرما ہے جس کی تفصیل آگے بیان ہو رہی ہے۔ فی الحال یہ بتانا مقصود ہے کہ ۱۹۱۱ء میں اقبال نے 'ملت بیضا پر عمرانی نظر' والا لیکچر جو علی گڑھ میں دیا (اور جس کی تیاری بظاہر ۱۹۱۰ء میں بھی ہوتی رہی تھی) وہ نظم 'شکوہ' پڑھنے سے چند روز قبل کی بات ہے لیکن اُس لیکچر کا تمام مضمون 'جوابِ شکوہ' اور رموزِ بیخودی کا ہے۔ نیز انجمن حمایت اسلام کے جس جلسے میں 'شکوہ' پڑھی اُسی میں ایک لیکچر بھی دیا جو ایک طرح سے 'ملتِ بیضا' والے لیکچر کا خلاصہ بھی ہے اور 'شکوہ' کے ذہنی پس منظر پر کافی روشنی بھی ڈالتا ہے۔ اس لیکچر کا خلاصہ کشمیری میگزین میں شائع ہوا اور وہاں سے لے کر عبداللہ قریشی صاحب نے اپنی ایک کتاب میں شامل بھی کر دیا مگر غالباً کسی کی توجہ اِس طرف نہ گئی کہ یہ لیکچر 'شکوہ' والے جلسے ہی میں دیا گیا۔

اقبال کے پورے نظامِ فکر کا بنیادی نکتہ اجتماعی خودی ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے پرانی بیاضوں کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہونے لگتا ہے کہ کیوں اور کیسے 'نورِ محمدیؐ' سے بحث کا آغاز کرنا چاہتے تھے اور پھر کیوں اسے خودی کے اثبات سے شروع کیا۔ یہ موضوع تفصیل طلب ہے اور صرف تشکیلی دور میں اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے امید ہے کہ بالخصوص اگلی کتاب درمیانی دَور میں یہ معاملہ صاف ہونے لگے گا جس کے لیے تشکیلی دَور میں ایک مستحکم بنیاد فراہم کی گئی ہے۔

فارسی میں شعر گوئی کا آغاز

اپریل ۱۹۰۷ء میں عطیہ فیضی والی غزلیں کہنے سے پہلے اقبال نے فارسی میں صرف چند نظمیں کہی تھیں اور اُس کے بعد آئندہ چھ برس میں بھی فارسی میں چند اشعار سے زیادہ نہ کہہ سکے۔ فارسی میں شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز جس واقعے سے ہوا وہ بہت حیرت انگیز ہے اور نجانے کیوں اس پر توجہ نہیں دی گئی ہے حالانکہ اس کا تذکرہ بعض کتابوں میں ہو بھی چکا ہے۔

یکم اگست ۱۹۱۳ء کو خواجہ حسن نظامی کے اخبار توحید میں یہ واقعہ شائع ہوا کہ اقبال نے خواب میں دیکھا کہ مولانا روم اُن سے مثنوی لکھنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ اقبال نے کہا کہ مثنوی کا حق آپ ادا کر گئے ہیں تو مولانا روم نے کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ اقبال بھی لکھیں۔ اس پر اقبال نے عرض کیا کہ آپ خودی کو مٹانے کی بات کرتے ہیں جبکہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قائم رکھنے کی چیز ہے۔ مولانا روم نے فرمایا کہ اُن کا مقصد بھی وہی ہے جو اقبال سمجھے ہیں۔ اس خواب کے بعد اقبال بیدار ہوئے تو زبان پر فارسی کے اشعار جاری تھے جنھیں حسن نظامی نے اس واقعے کے ساتھ اسرارِ خودی کے عنوان سے شائع کر دیا (یہ عنوان بھی شائد حسن نظامی ہی نے دیا تھا)۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان اشعار کی تعداد اس سے پہلے لکھے ہوئے تمام فارسی اشعار کے قریباً برابر ہے اور اس کے بعد کئی برس تک اقبال پر فارسی ہی میں آمد ہوتی رہی۔ یہ بھی معلوم ہے کہ وہ عمر بھر فارسی میں باقاعدہ گفتگو کرنے میں دقت محسوس کرتے رہے لہٰذا افغان قونصل سے گفتگو کے لیے مترجم کو ساتھ لے جاتے تھے۔ پھر بھی فارسی میں چھ سے زیادہ شعری تصانیف چھوڑ گئے جن کی داد صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ایران میں بھی دی جاتی ہے حالانکہ ایرانی کسی غیر اہلِ زبان کی فارسی شاعری کا آسانی سے لوہا ماننے والے نہیں ہیں۔

اقبال خود نہیں چاہتے تھے کہ اُن کے افکار کی تشریح کے لیے اُن کی زندگی کے روحانی پہلوؤں کو اس طرح زیرِ بحث لایا جائے کہ کسی کشفی نظریے کی داغ بیل پڑنے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ وہ مسلمانوں کو ایک پژمردہ ذہنی فضا سے نکالنا چاہتے تھے اس لیے یہ احتیاط بالکل جائز بھی تھی۔ اس کے علاوہ اقبال وجدان کو فکر سے جدا بھی نہیں سمجھتے تھے اور اسے عقل کی کسوٹی پر پرکھنا ممکن سمجھتے تھے البتہ اس مقصد کے لیے جن ذہنی وسائل کی ضرورت پڑ سکتی ہے وہ اُن کے خیال میں اُس وقت دستیاب نہ تھے (جیسا کہ تشکیلِ جدید کے دیباچے اور ابتدائی خطبات سے اندازہ ہوتا ہے)۔ البتہ اُن سوانح نگاروں کے بارے میں کیا کہا جائے جنھوں نے اقبال کی اس ہدایت پر بڑی سعادت مندی سے عمل کرتے ہوئے اُن کے روحانی واردات کو تو بہت احتیاط سے چھپائے رکھا مگر دوسری طرف اقبال کی نفسیاتی گرہیں کھولنے کی کوششیں بھی فرماتے رہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ عطیہ فیضی کے نام خطوط کی روشنی میں پوری تحلیلِ نفسی کر کے رکھ دی جائے یا نطشے کے مہیب سائے لاشعور میں تلاش کیے جائیں مگر روحانی واقعات خواہ مستند ہی کیوں نہ ہوں سرے سے خاطر ہی میں نہ لائے جائیں۔

مولانا روم کو خواب میں دیکھنے سے کوئی قطب یا ابدال نہیں ہو جاتا مگر بہرحال اِس خواب کے اثر میں اسرار و رموز سے شروع ہو کر جاوید نامہ جیسے حیرت انگیز شاہکار تک پہنچنے والی شاعری خود بھی کسی معجزے سے کم تو نہیں ہے۔ ایک سوانح نگار کیسے اس بات پر راضی ہو جائے کہ اِس شاعری کے آغاز میں کوئی ایسی

بات پیش نہ کی جائے جو اِس کی ماورائے عقل وجدانی کیفیات سے میل کھاتی ہو۔ یہ خواب تو اقبال نے نہ صرف حسن نظامی کے اخبار میں شائع کروایا بلکہ اسرارِ خودی کی تمہید میں بھی اسے بیان کیا:

اقبال کے بارے میں عام طور پر پوچھا جاتا ہے، ''اقبال نے مولانا روم ہی کو اپنا مرشد کیوں بنایا؟''۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ صاف جواب یہ ہے کہ اقبال نے مولانا روم کو نہیں بلکہ مولانا روم نے اقبال کو منتخب کیا تھا۔

اقبال اور آغا حشر کاشمیری

عام طور پر یہ بات معلوم ہے کہ جنگِ بلقان کے دنوں میں آغا حشر کاشمیری نے 'شکریۂ یورپ' کے عنوان سے ایک نظم پڑھی تھی۔ یہ نظم انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں ۲۲ مارچ ۱۹۱۳ء کو پڑھی گئی۔ آخری بند زیادہ مشہور ہے:

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لیے

اسی بند کا شعر ہے:

رحم کر، اپنے نہ آئینِ کرم کو بھول جا!
ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تُو نہ ہم کو بھول جا

اب اصل شعر سے زیادہ اکبرالہ آبادی کی پیروڈی مشہور ہے:

''رحم کر، اپنے نہ آئینِ کرم کو بھول جا!''
''کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا!''

تشکیلی دَور کے لیے مواد اکٹھا کرتے ہوئے اس نظم کے حوالے سے کچھ بہت ہی چونکا دینے والی باتیں میرے سامنے آئی ہیں:

۱- نظم کا موضوع یہ تھا کہ مغرب کی یلغار نے مشرق، خاص طور پر اِسلامی مشرق کو زندہ کر دیا۔ نہ صرف اسرارِ خودی میں اقبال یہ کہنے والے تھے کہ دشمن کا مقابلہ طاقت میں اضافے کا سبب بنتا ہے بلکہ دس برس بعد 'طلوعِ اسلام' کے عنوان سے پوری نظم حشر کی نظم کے مرکزی خیال پر لکھنے والے تھے۔

۲- حشر نے مغرب سے جو کہا ''صرفِ تصنیفِ ستم ہے فلسفہ دانی تری،'' یہ آگے چل کر اقبال کی شاعری کا مستقل موضوع بننے والا تھا۔

۳- حشر کی نظم کا ماحول ''پر زغوغا شد جہاں...'' (دنیا شور سے بھر گئی) جاوید نامہ کے آغاز میں دنیا کی تخلیق کے منظر میں جھلکنے والا تھا، ''ہر جگہ خودگری کے ذوق وشوق سے 'میں اور ہوں، تم اور ہو' کا نعرہ...'':

ہر کجا از ذوق و شوقِ خودگری
نعرۂ من دیگرم تو دیگری

۴- حشر نے مغرب سے کہا ''تیرے دم سے آج دنیا ایک ماتم خانہ ہے'' اور تئیس برس بعد یہی مصرع فارسی میں بدل کر اقبال کی اہم تصنیف پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق کے مرکزی خیال کو ظاہر کرنے والے اشعار میں سے ہونے والا تھا:

آدمیت زار نالید از فرنگ

۵- اقبال نے دو برس پہلے جو اشعار کہے اور عطیہ فیضی کو بھیجے تھے، ''نالہ را اندازِ نو ایجاد کن...'' وہ ابھی کہیں شائع نہ ہوئے تھے مگر حشر کی نظم کے چوتھے بند کا ٹیپ کا شعر اِنھی سے ماخوذ لگ رہا تھا:
''طرحِ نو انداز و بنیادِ جہاں از سر فگن!''

۶- اس میں اقبال کی ایک اور غزل کے شعر کا رنگ بھی جھلک رہا تھا، ''طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم'' مگر وہ اپریل ۱۹۰۷ء میں کیمبرج کی پکنک والی غزلوں میں سے تھی جنھیں اُس وقت تک اقبال نجی نظموں میں شمار کرتے تھے۔

اقبال اور آغا حشر کے درمیان شاعری کے بارے میں بات چیت ہوتی تھی، یہ معلوم ہے مگر یہ دونوں کس حد تک ایک دوسرے کے مزاج میں دخیل ہو گئے تھے؟ اقبال کے رنگ میں لکھنے کی کوشش بہت لوگوں نے کی، کامیابی کسی کو حاصل ہوئی نہ ہونی تھی سوائے حشر کے جو نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ وہ باتیں بھی کہہ گئے جو ابھی اقبال نے خود نہ کہی تھیں مگر آیندہ زبان سے ادا ہونی تھیں۔ انفرادیت کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹا۔

مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ حشر نے یہ نظم بالکل انھی دنوں لکھی جب مولانا روم کو خواب میں دیکھنے کے بعد اقبال ایک نئے پیغام کا آغاز کر رہے تھے۔ انجمن کے جس جلسے میں یہ نظم سنائی اُسی کے ایک اجلاس میں اپنی زیرِ تصنیف مثنوی کے اشعار سنائے۔ یہ بہت غور طلب بات ہے کہ بالکل اُسی زمانے میں اقبال کے پیغام کے بہت سے گوشے جو ابھی تک سامنے نہ آئے تھے، حشر کی 'شکریۂ یورپ' میں بے نقاب ہو گئے۔

حشر کی نظم میں آٹھ بند تھے جن میں سے پہلے سات منطق الطیر کی سات وادیوں کی اُس تشریح سے مربوط تھے جو حشر کے ڈراموں کے گہرے تجزیے یا پھر اقبال کے آیندہ کلام سے برآمد ہو سکتی تھی۔ آٹھواں بند حاصلِ بحث تھا۔ میں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

کچھ اور بات بھی معلوم ہوتی ہے۔ اجتماعی خودی کے وجود کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہوسکتا تھا کہ اس سے فیض پانے والے دو شاعروں کے موجودہ نظریات ہی میں نہیں بلکہ نشو ونما کے امکانات میں بھی یکسانیت ہو۔

اجتماعی خودی کی تشریح آگے ہونے والی ہے، فی الحال یہی عرض کرسکتا ہوں کہ تاریخ خاموش ہے مگر الفاظ بول رہے ہیں۔ اپنے دل کا ایک اور دیرینہ مطلب استعاروں میں چھپاتے ہوئے مزید کہتا چلوں کہ ہماری تقدیر میں محکومی و مظلومی اِسی لیے ہے کہ ہم اپنی خودی سے انصاف نہ کر سکے۔ آغا حشر کا انتقال ۱۹۳۵ء میں ہوا اور اُس کے بعد ہم نے ایسے لوگوں کو بھی تنقید کے منصب پر فائز کر دیا جو حشر کے تھیٹر میں پرامپٹر کے فرائض انجام دینے کے لائق بھی نہ تھے۔ اُن کی بے ادبی کی وجہ سے اب آغا حشر کا نام مذاق اُڑانے کے لائق سمجھا جاتا ہے لہٰذا شائد بعض قارئین کو اِس پر حیرت ہو رہی ہو کہ میں آغا حشر کی نظم کو اقبال سے ملا رہا ہوں۔ آپ کی تشفی کے لیے پوری 'شکریۂ یورپ' کتاب میں شامل کی گئی ہے۔ دو بند یہاں بھی پیشِ خدمت ہیں۔ فیصلہ کر لیجیے کہ یہ آہنگ تعریف کے قابل ہے یا نہیں:

ہاں چھڑک پیشانیِ ظلمت پہ افشانِ سحر
ٹانگ دے دامانِ شب میں پھر گریبانِ سحر
پُرنوا کر دل کو سوزِ احمدِ بے میم سے
جگمگا دے بزمِ جاں کو شمعِ ابراہیم سے
اپنی ہستی نذر دے ملت کی قرباں گاہ کو
زندہ کر دنیا میں آئینِ خلیل اللہ کو
ڈال دے شورِ نوا معمورۂ ظلمات میں
دوڑ جا آہنگ بن کر سازِ موجودات میں
خاک کو بھر دے سرورِ آسماں پرداز سے
گرم کر دے روحِ مستی شعلۂ آواز سے
حسن آرایش کو زینت عالمِ امکاں کو دے
خلعتِ تجدید آئینِ کہن ساماں کو دے
کلیاتِ دہر کی اِک شرحِ نو تحریر کر
نظمِ ہستی کی نئے الفاظ میں تفسیر کر

طرحِ نو انداز و بنیادِ جہاں از سر فگن!
شعلہ در پیراہنی آتش بخشک و تر فگن!

تیری لب بندی سبق آموزِ گویائی ہوئی
طعنہ زن ہیں تجھ پہ قومیں تیری ٹھکرائی ہوئی
آج اُن ذروں کو بھی ناز اپنی تابانی پہ ہے
تیرے در کا نقشِ سجدہ جن کی پیشانی پہ ہے
منتظر نظارے ہیں چشمِ خمار آلود کھول
اٹھ کلیدِ فتح بن، قفلِ درِ مقصود کھول

اے خوشا غفلت جو ممنونِ اثر کچھ بھی نہیں
کان نے سب کچھ سنا دل کو خبر کچھ بھی نہیں
گو صدائے ہمت افزا تا بگوش آتی رہی
نالہ بن کر پیہم آوازِ سروش آتی رہی
پھر بھی ننگِ زندگی آسودۂ خواری رہا
سونے والے پر وہی خوابِ گراں طاری رہا
جب تغافل اپنا شیوہ خفتہ قسمت نے کیا
اور ہی سامانِ بیداری مشیت نے کیا

دفعتہً از جلوۂ عیسیٰ افق تابندہ شد
قم باذنی گفت مغرب روحِ مشرق زندہ شد

اے زمینِ یورپ، اے مقراضِ پیراہن نواز
اے حریفِ ایشیا! اے شعلۂ خرمن نواز
چارہ سازی تیری بنیاد افگنِ کاشانہ ہے
تیرے دم سے آج دنیا ایک ماتم خانہ ہے

اشکِ حسرت زا سے چشمِ حریت نمناک ہے
خوں چکاں رودادِ اقوامِ گریباں چاک ہے
صرف تصنیفِ ستم ہے فلسفہ دانی تری
آدمیت سوز ہے تہذیبِ حیوانی تری
عظمتِ دیرینہ نالاں ہے ترے برتاؤ سے
ڈھل گیا حسنِ قدامت خون کے چھڑکاؤ سے
جلوہ گاہِ شوکتِ مشرق کو سونا کر دیا
جنتِ دنیا کو دوزخ کا نمونہ کر دیا
اٹھ رہا ہے شورِ غم خاکسترِ پامال سے
کہہ رہا ہے ایشیا رو کر زبانِ حال سے

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے